(۳۶)

دیبی دین نے چائے کی دکان اسی دن بند کردی اور دن بھر اس عدالت کی خاک چھانتا پھرتا تھا جس میں ڈکیتی کا مقدمہ پیش تھا، رمانا تھ کی شہادت ہو رہی تھی، تین دن رما کی شہادت برابر ہوتی رہی اور تینوں دن دیبی دین نے کچھ کھایا نہ سویا۔ آج بھی اس نے گھر آتے ہی آتے کرتا اتار کر رکھ دیا اور ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا، پھاگن لگ گیا تھا اور کچھ کچھ گرمی شروع ہوگئی تھی لیکن اتنی گرمی نہ تھی کہ پسینہ چلے اور پنکھے کی ضرورت ہو۔ اکثر لوگ تو ابھی تک جاڑے کے کپڑے پہنے تھے، لیکن دیبی دین پسینے میں تر تھا اس کا چہرہ جس پر معصوم بڑھاپا بہتا رہتا تھا۔ کھیا یا ہوا تھا گویا بیگار سے لوٹا ہوا ہو۔

جگو نے لوٹے میں پانی لاکر رکھ دیا اور بولی، چلم بھر دوں۔

دیبی دین کی یہ تین دن کی خاطر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے بڑھیا کبھی چلم رکھنے کو نہ پوچھتی تھی۔ دیبی دین اس کا مطلب سمجھتا تھا، بڑھیا کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ نہیں رہنے دو۔ چلم نہ پیوں گا۔

تو ہاتھ منہ دھو لو گرد پڑی ہوئی ہے۔

دھو لونگا۔ جلدی کیا ہے۔

بڑھیا آج کا واقعہ سننے کے لئے بے قرار تھی۔ ڈر رہی تھی کہ دیبی دین جھنجلا نہ پڑے اور اس کی تھکن مٹا دینا چاہتی تھی، جس میں دیبی دین خوش ہو کر آپ ہی سارا قصہ کہہ چلے۔

تو کچھ جل پان تو کرو۔ دوپہر کو بھی تو کچھ نہیں کھایا۔ مٹھائی لاؤں، پنکھا مجھے دے دو!

دیبی دین نے پنکھا دے دیا، بڑھیا جھلنے لگی، دو تین منٹ تک آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کہا۔ آج بھیا کی گواہی ختم ہوگئی۔

بڑھیا کا ہاتھ رک گیا، تو کل سے وہ گھر آجائیں گے۔

دیبی، ابھی نہیں چٹھی ملی جاتی، یہی بیان دیوانی میں دینا پڑے گا اور اب وہ یہاں آنے ہی کیوں لگے، کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ گھوڑے پر چڑھے چڑھے گھومیں گے، مگر ہے بڑا پکا مطلبی۔ پندرہ آدمیوں کو بے گناہ پھنسا دیا۔ پانچ چھ کو تو پھانسی ہو جائے گی، دوسروں کو دس دس بارہ بارہ سال کی سجا دھری رکھی ہے، اس کے بیان سے مقدمہ ثبوت ہو گیا، کوئی کتنی ہی جرح کرے، کیا مجال کہ جرا بھی ہچکچائے۔ اب ایک بھی نہ بچے گا کس نے کیا، کس نے نہیں کیا۔ اس کا حال بھگوان جانیں پر سب مارے جائیں گے گھر سے بھی سب سرکاری روپیہ کھا کر بھاگا تھا ہمیں بڑا دھوکا ہوا۔

جگو نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا، اپنی نیکی بدی اپنے ساتھ ہے، مطلب کے لئے تو دنیا ہے کون کس کے لئے مرتا ہے۔

دیبی، اپنے مطلب کے لئے جو دوسروں کا گلا کاٹے۔ اس کو جہنم دے دینا بھی پاپ نہیں ہے۔

یکایک دو آدمی آکر کھڑے ہو گئے، ایک گورا خوبصورت لڑکا تھا جس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زاید نہ تھی۔ دوسرا ادھیڑ تھا اور صورت سے چپڑاسی معلوم ہوتا تھا۔

دیبی دین نے پوچھا، کسے کھوجتے ہو۔

چپڑاسی نے کہا تمہارا ہی نام دیبی دین ہے نا، میں اخبار کے دفتر سے آیا ہوں یہ بابو انہیں رمانا تھ کے بھائی ہیں جنہیں شطرنج کا انعام ملا تھا، یہ انہیں کی تلاش میں دفتر گئے تھے۔ ایڈیٹر صاحب نے تمہارے پاس بھیجا ہے، تو میں جاؤں؟

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ دیبی دین نے گوپی کو سر سے پاؤں تک دیکھا، صورت رمانا تھ سے ملتی تھی بولا آؤ بیٹا بیٹھو۔ کب آئے گھر سے۔

گوپی نے ایک کھٹنک کی دکان پر بیٹھنا شان کے خلاف سمجھا کھڑا کھڑا بولا۔

آج ہی تو آیا ہوں ۔ بھائی جی ساتھ ہیں دھرم شالہ میں ٹھہرا ہوں ۔

دیبی دین نے کھڑے ہو کر کہا ۔ تو جا کر بہو کو یہیں لائو نا ۔ اوپر تو رما بابو کا کمرہ ہے ہی آرام سے رہو ۔ دھرم سالے میں کیوں پڑے رہو گے ۔ نہیں چلو میں بھی چلتا ہوں ۔ یہاں سب طرح کا آرام ہے ۔

اس نے جگو کو یہ خبر سنائی ۔ اور اوپر جھاڑو لگانے کو کہہ کر گوپی کے ساتھ دھرم شالے چل دیا ۔ بڑھیا نے فوراً اوپر جا کر جھاڑو لگائی ۔ لپک کر حلوائی کی دکان سے مٹھائی اور دہی لائی ، صراحی میں پانی بھر کر رکھ دیا ۔ پھر اپنا منہ ہاتھ دھویا ۔ ایک رنگین ساڑھی نکالی گہنے پہنے اور بن ٹھن کر بہو کا انتظار کرنے لگی ۔

ذرا دیر میں فلٹن بھی آ پہنچی ۔ بڑھیا نے جا کر جالپا کو اتارا ۔ جالپا پہلے تو ساگ بھاجی کی دکان دیکھ کر کچھ جھجکی ، مگر بڑھیا کی مادرانہ خاطر مدارات دیکھ کر اس کی جھجک دور ہو گئی ۔ اس کے ساتھ اوپر گئی تو ہر ایک چیز اس طرح اپنی جگہ پر پائی گو یا اپنا ہی گھر ہو ۔

جگو نے لوٹے میں پانی رکھ کر کہا ۔ اس گھر میں بھیا رہنے تھے بیٹی ۔ آج تو پندرہ دن سے گھر سونا پڑا ہوا ہے ، منہ ہاتھ دھو کر منہ جو ٹھا کر لو ۔ بھیا کا حال تو ابھی تمہیں نہ معلوم ہو گا ۔

جالپا نے سر ہلا کر کہا ۔ کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہوا ۔ اخبار کے دفتر میں اتنا معلوم ہوا کہ پولیس نے گرفتار کر لیا ۔

دیبی دین بھی اوپر آ گیا تھا ۔ بولا ۔ گرفتار تو کیا تھا مگر اب تو وہ ایک معاملہ میں سرکاری گواہ ہو گئے ہیں ۔ پراگ راج میں ان پر اب کوئی مقدمہ نہ چلے گا اور سنا ہے نوکری چاکری بھی مل جائے گی ۔

جالپا نے بے خوفی کے ساتھ کہا ۔ وہاں تو ان پر کوئی مقدمہ نہیں ہے ۔

دیبی دین نے ڈرتے ڈرتے کہا، سُنا ہے کچھ روپے پیسے کا معاملہ تھا۔
جالپا۔ وہ تو کوئی بات نہ تھی، جوں ہی ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان سے کچھ سرکاری رقم خرچ ہو گئی ہے اسی وقت روپے داخل کر دیئے۔ یہ فضول گھبرا کر چلے آئے۔ اور پھر ایسی چپ سادھی کہ اپنی خبر تک نہ دی۔

دیبی دین کا چہرہ روشن ہو گیا، گویا کسی درد سے آرام مل گیا ہو۔ بولا، تو یہ ہم لوگوں کو کیا معلوم، بار بار سمجھایا کہ گھر چٹھی تیر بھیج دو۔ لوگ گھبراتے ہونگے مگر مارے شرم کے لکھتے ہی نہ تھے۔ اسی دھوکے میں پڑے ہوئے تھے کہ وہاں ان پر مقدمہ چل رہا ہوگا۔ جانتے تو سرکاری گواہ کیوں بنتے۔

سرکاری گواہ قوم میں کتنی بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ اسے کتنا ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں، یہ اس سے چھپا نہ تھا سرکاری گواہ کیوں بنائے جاتے ہیں۔ کس طرح انہیں ترغیبیں دی جاتی ہیں، کس طرح وہ پولیس کے کٹھ پتلے بن کر اپنے ہی دوستوں کا گلا گھونٹتے ہیں، یہ اسے معلوم تھا اگر کوئی آدمی اپنی ناہمواریوں پر شرمندہ ہو کر حقیقت کا انکشاف کرے، دغا اور فتنہ انگیزی کا پردہ ہٹا دے تو وہ فرشتہ ہے۔ اس کی حق پسندی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، مگر شرط یہی ہے کہ وہ اپنے رفیقوں کے ساتھ اپنے کئے کا پھل بھوگنے کو تیار ہو، ہنستا کھیلتا پھانسی پر چڑھ جائے۔ لیکن اپنی جان بچانے کے لئے یا خود غرضی کے زیر اثر سزا سے خائف ہو کر جو اپنے رفیقوں سے دغا کرے آستین کا سانپ بن جائے، وہ نامرد ہے، بے غیرت ہے۔ بے حیا ہے۔ ایسے آدمی کو دنیا کبھی معاف نہیں کرتی، کبھی نہیں، یہاں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا، رمانے سزا کے خوف سے اپنے کردہ گناہوں کا پردہ نہیں کھولا تھا، اس میں کم سے کم سچائی تو ہوئی قابل نفرین ہونے پر بھی بات تو سچی ہوتی، یہاں تو ان گناہوں کا پردہ کھولا گیا تھا جن کی ہوا تک اسے نہ لگی تھی۔ جالپا کو اس کا یقین نہ آیا، ضرور کوئی نہ کوئی بات اور ہوئی ہوگی۔ جس نے رما کو سرکاری گواہ

بننے پر مجبور کر دیا ہوگا، شرماتی ہوئی بولی۔ کیا یہاں بھی کوئی بات ہو گئی تھی؟

دیبی دین نے اطمینان انگیز لہجہ میں کہا۔ کوئی بات نہیں۔ پراگ راج سے وہ میرے ساتھ ہی یہاں آئے۔ جب سے یہاں سے کہیں گئے نہیں باہر نکلتے ہی نہ تھے۔ بس ایک دن نکلے اور اسی دن پولیس نے پکڑ لیا۔ ایک سپاہی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ڈرے کہ مجھی کو پکڑنے آرہا ہے بھاگ کھڑے ہوئے۔ سپاہی کو کھٹکا ہوا کہ اس نے شبہ میں گرفتار کر لیا۔ میں بھی ان کے پیچھے تھانے پر پہنچا۔ درو گا پہلے تو رسوت مانگتے تھے مگر جب میں روپے لے کر پہنچا تو وہاں اور ہی گل کھلا ہوا تھا۔ افسروں نے نہ جانے ان سے کیا بات چیت کی بس سرکاری گواہ بن گئے۔ مجھ سے بھیّا نے یہی کہا کہ اس معاملے میں بالکل جھوٹ نہ بولنا پڑے گا۔ میں کیا کرتا چپ ہو رہا۔

جگو۔ نہ جانے سبھوں نے کونسی بوٹی سنگھا دی۔ بھیّا تو ایسے نہ تھے دن بھر اماں اماں کرتے رہتے تھے۔ دکان پر سبھی طرح کے لوگ آتے ہیں مرد بھی عورت بھی۔ کیا مجال کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔

دیبی۔ کوئی برائی نہ تھی۔ میں نے تو ایسا لڑکا ہی نہیں دیکھا۔

جالپا نے کچھ سوچ کر کہا۔ کیا ان کا بیان ہو گیا۔

دیبی۔ ہاں تین دن برابر ہوتا رہا۔

جالپا نے پوچھا۔ ان سے میری ملاقات تو ہو جائے گی۔

دیبی دین نے مسکرا کر کہا۔ ہاں اور کیا جس میں سارا بھنڈا پھوڑ کر رکھ دو پولیس ایسی گدھی نہیں ہے۔ آجکل کوئی بھی ان سے ملنے نہیں پاتا۔ کڑا پہرہ رہتا ہے۔

اس مسئلہ پر اس وقت زیادہ گفتگو نہ ہو سکی۔ اس گتھی کو سلجھانا آسان نہ تھا۔ جالپا نے گوپی کو بلایا وہ چبوترے پر کھڑا مٹرک کا تماشہ دیکھ رہا تھا گویا سسرال آیا ہو۔ جالپا نے کہا۔ منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا لو تو۔

گوپی شرما کر پھر باہر چلا گیا۔

دیبی دین سمجھ گیا کہ ہم لوگوں کے سامنے یہ لڑکا کچھ کھاتے شرماتا ہے بولا۔ تو اب ہم دونوں جاتے ہیں تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو ہم سے کہہ دینا۔ بھیّا کو تو ہم اپنا ہی سمجھتے تھے اور ہمارے کون بیٹھا ہوا ہے۔

جگو نے غرور سے کہا۔ وہ تو ہمارے ہاتھ کا بنایا ہوا کھا لیتے تھے۔

جالپا مسکرا کر بولی۔ اب نہیں کھانا نہ پکانا پڑے گا ماں جی۔ میں پکا دیا کروں گی۔

جگو نے ٹوکا۔ ہماری برادری میں دوسرے کے ہاتھ کا کھانا منع ہے بہو۔ اب چار دن کے لئے برادری میں کیا تکو بنیں۔

جالپا۔ ہماری برادری میں بھی تو دوسروں کے ہاتھ کا کھانا منع ہے۔

جگو۔ نہیں یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔ پھر پڑھے لکھے آدمی ان باتوں کا بچار بھی تو نہیں کرتے۔ ہماری برادری تو گنواروں کی ہے۔

جالپا۔ یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ تم پکاؤ اور میں کھاؤں جسے بہو بنایا اس کے ہاتھ کا کھانا پڑے گا۔

اس اپنے پن سے بھرے ہوئے جملے نے دیبی دین کے دل پر چوٹ کی۔ بولا۔ بہو نے بات تو بڑے پتہ کی کہی۔ اس کا جواب سوچکر دینا ہوگا۔ ابھی چلو، ان لوگوں کو آرام کرنے دو۔

دونوں چلے گئے۔ تو گوپی نے آکر کہا۔ بھیّا اسی کھٹک کے یہاں رہتے تھے کیا، کھٹک ہی معلوم ہوتا ہے۔

جالپا نے پٹکار کر کہا۔ کھٹک ہوں یا چمار ہوں لیکن ہم سے اور تم سے سو گنے اچھے ہیں۔ ایک پردیسی آدمی کو چھ مہینے تک گھر میں رکھا، کھلایا پلایا، ہم میں ہے اتنی ہمت۔ یہاں تو کوئی مہمان آجاتا ہے تو وہ بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ اگر یہ لوگ نیچے ہیں تو ہم ان

سے کہیں نیچے ہیں۔

گوپی منہ ہاتھ دھو چکا تھا، مٹھائی کھاتا ہوا بولا۔ کسی کو ٹھہرا لینے سے کوئی اُونچا نہیں ہو جاتا، چار کتنا ہی دان پُن کرے پر رہے گا چمار ہی۔

جالپا، میں اس چمار کو اس پنڈت سے اچھا سمجھوں گی۔ جو دوسروں کو دغا دے۔

جل پان کر کے گوپی تو شہر گھومنے چلا گیا، جالپا نے کچھ نہ کھایا۔ اس کے سامنے ایک مشکل مسئلہ درپیش تھا۔ رما کو اس دلدل سے کیسے نکالے۔ اس رسوائی اور جگ ہنسائی کے خیال سے ہی اس کا ضمیر مجروح ہو اُٹھتا تھا۔

ان بے گناہوں کا خون کس کی گردن پر ہوگا۔ ملزموں میں نہ جانے کون گنہگار ہے۔ کون بے گناہ ہے سبھی سزا پا جائیں گے۔ شاید دو چار کو پھانسی ہو جائے۔ یہ خون ناحق کس کی گردن پر ہوگا۔

اس نے پھر سوچا، لوگ کہتے ہیں یہ ڈھکوسلا ہے، کون جانتا ہے کسی پر ہتیا پڑتی ہے یا نہیں، یہ بھی مان لیا کہ کسی پر ہتیا نہ پڑے گی۔ لیکن اپنی غرض کے لئے دوسروں کو خطرہ میں ڈالنا کتنا شرمناک ہے، رمانے اسے قبول ہی کیوں کیا۔ اگر مقدمہ چلنے کا خوف بھی تھا تو سال دو سال کی قید کے سوا اور کیا ہوتا۔ محض اس سزا سے بچنے کے لئے یہ دغا۔ اب معلوم بھی ہو جائے کہ میونسپلٹی کچھ نہیں کر سکتی تو کیا ہو سکتا ہے۔ ان کی شہادت تو ہو ہی گئی۔

یکایک ایک نقطہ کسی باریک کیل کی طرح اس کے دل میں چبھ گیا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ اپنا بیان تبدیل کر دیں۔ انہیں معلوم ہو جائے کہ ان پر کوئی مقدمہ نہ چلے گا تو شاید خود ہی اپنا بیان بدل دیں۔ مگر یہ معاملہ ان کے کانوں تک کیسے پہنچے۔

وہ اضطراب کے عالم میں نیچے آئی۔ اور دیبی دین سے بولی۔ کیوں دادا ان کے پاس کوئی خط بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پہرہ والوں کو دس پانچ روپے دینے سے تو شاید خط پہنچ جائے۔

دیبی دین نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔ مشکل ہے۔ پہرہ پر بڑے بھینچے ہوئے آدمی رکھے گئے ہیں، میں دو بار گیا تھا سبھوں نے پھاٹک پر کھڑا بھی نہ ہونے دیا۔

اس بنگلے کے آس پاس مکان دکان تو ہوں گے۔

ہاں ہیں کیوں نہیں۔ ایک طرف تو دوسرا بنگلہ ہے۔ دوسری طرف آموں کا باغ ہے سامنے سڑک ہے۔

شام کو وہ گھومنے گھامنے تو نکلتے ہی ہوں گے۔

ہاں نکلتے تو ہیں۔ لیکن پولیس کے دو ایک المپیر ساتھ رہتے ہیں۔

اگر کوئی باغ میں چھپ کر بیٹھے تو کیا ہو، جب انہیں اکیلے دیکھے خط پھینک دے وہ ضرور اٹھائیں گے۔

دیبی دین نے سوچکر کہا۔ ہاں ہو سکتا ہے۔ لیکن اکیلے ملیں تب تو۔

ذرا اور اندھیرا ہوا تو جالپا نے دیبی دین کو ساتھ لے لیا اور رما ناتھ کا بنگلہ دیکھنے چلی۔ ایک خط لکھ کر جیب میں رکھ لیا تھا بار بار دیبی دین سے پوچھتی۔ اب کتنی دُور ہے سوچتی ہوں کہیں رما تنہا ٹہلتے ہوئے مل جائیں تو کیا پوچھنا ہے۔ خط کو رومال میں باندھ کر ان کے سامنے پھینک دوں۔

دفعتًہ اسے ایک اندیشہ پیدا ہوا۔ کہیں وہ خط پا کر بھی اپنا بیان نہ بدلیں تو کیا ہوگا۔ کون جانے اب میری یاد بھی انہیں ہے یا نہیں۔ کہیں مجھے دیکھ کر وہ منہ پھیر لیں تو کیا ہو۔ اس خیال سے وہ سہم اٹھی۔

اس نے دیبی دین سے پوچھا۔ کیوں دادا، وہ کبھی ہم لوگوں کا ذکر بھی کرتے تھے

دیبی دین نے سر ہلا کر کہا کبھی نہیں۔ ہاں اُداس بہت رہتے تھے۔

اس جواب نے جالپا کو اور بھی تردد میں ڈال دیا۔ شہر کی گھنی بستی سے یہ لوگ دُور نکل آئے تھے چاروں طرف سناٹا تھا۔ دن کی تیز روی کے بعد اس وقت ہوا

بھی آرام کر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت اور میدان چاندنی کی گرد آلود روشنی میں بے جان سے معلوم ہوتے تھے۔ جالپا کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس کی کوشش کا کچھ حاصل نہیں ہے اس کی بادیہ پیمائی بالکل بے سود ہے۔ اس لیتی ہیں اس کی حالت بے کس لڑکی کی سی ہے جو مٹھی بھر اناج کے لئے در بدر پھرتا ہو۔ وہ جانتا ہے۔ اگلے دروازہ پر بھی اسے کچھ نہ ملے گا شاید گالیاں ہی ملیں۔ پھر بھی دستِ سوال پھیلا دیتا ہے۔ یہ اُمید کا سہارا نہیں مایوسی کا سہارا ہے۔

یکایک سڑک کے داہنی طرف بجلی کی روشنی نظر آئی۔

دیبی دین نے ایک بنگلے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ وہی ان کا بنگلہ ہے۔

جالپا نے مایوسانہ نظروں سے ادھر دیکھا۔ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آدمی نہ تھا۔ پھاٹک پر تالا پڑا ہوا تھا۔ بولی یہاں تو کوئی نہیں ہے۔

دیبی دین نے پھاٹک کے اندر جھانک کر کہا۔ شاید بنگلہ چھوڑ دیا۔ دیکھو میں پتہ لگاتا ہوں۔

بنگلے کی دائیں طرف آموں کے باغ میں روشنی نظر آئی۔ شاید کھٹک باغ کی رکھوالی کر رہا تھا۔ دیبی دین نے باغ میں آکر پکارا۔ کون ہے۔ یہاں کس نے یہ باغ لیا ہے۔

ایک آدمی آموں کے جھرمٹ میں سے نکل آیا۔ دیبی دین نے اسے پہچان کر کہا۔ ارے تم ہو جنگلی۔ تم نے یہ باغ لیا ہے۔ جنگلی ٹھنگنا سا گٹھیلا آدمی تھا دیبی دین کی آواز پہچان کر بولا۔ ہاں دادا لے تو لیا مگر کچھ ہے نہیں، گھاٹا ہی رہے گا۔ تم یہاں کیسے آ گئے۔

دیبی۔ کچھ نہیں یوں ہی چلا آیا اس بنگلہ والے آدمی کہاں گئے۔

جنگلی نے ادھر اُدھر چوکنی آنکھوں سے دیکھ کر ان بنیوں میں کہاں۔ اس میں جو مجسٹریٹ ٹکا ہوا تھا آج سب چلے گئے۔ سنتے ہیں پندرہ بیس دن میں آوینگے پڑھے لکھے

آدمی بھی ایسے دگا باج ہوتے ہیں دادا سراسر جھوٹی گواہی دی۔ نہ جانے اس کے بال بچے ہیں یا نہیں۔ بھگوان سے بھی نہ ڈرا۔

جالپا وہیں کھڑی تھی۔ دیبی دین نے جنگلی کو اور زہر اگلنے کا موقعہ نہ دیا۔ بولا۔ تو پندرہ بیس دن میں آئیں گے۔ خوب معلوم ہوا ہے۔

ہاں۔ وہی پہرے والے کہہ رہے تھے۔

کچھ معلوم ہوا کہاں گئے ہیں۔

وہی موقع دیکھنے گئے ہیں جہاں واردات ہوئی تھی۔

دیبی دین چلم پینے لگا اور جالپا سڑک پر آکر ٹہلنے لگی۔ رما کی یہ توہین سن کر اس کا دل پاش پاش ہوا جاتا تھا۔ اُسے رما پر غصہ نہ آیا۔ رنج بھی نہ ہوا۔ بلکہ اسے ہاتھوں کا سہارا دیکر اس دلدل سے نکالنے کے لئے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ رما چاہے اسے دتکار ہی کیوں نہ دے اُسے ٹھکرا ہی کیوں نہ دے۔ مگر وہ اسے معصیت کے اس غار میں نہ گرنے دے گی۔

جب دونوں یہاں سے چلے تو جالپا نے پوچھا۔ اس آدمی سے کہہ دیا ہے کہ جب وہ آئیں تو ہمیں خبر دے دے۔

ہاں کہہ دیا ہے۔

(۳۷)

ایک مہینہ گذر گیا۔ گوپی ناتھ پہلے تو کئی دن کلکتہ کی سیر کرتا رہا۔ مگر چار پانچ دن میں ہی یہاں سے اس کا جی ایسا اُچاٹ ہوا کہ گھر کی رٹ لگانی شروع کی۔ آخر جالپا نے اُسے لوٹا دینا ہی اچھا سمجھا۔ یہاں تو وہ چھپ چھپ کر رویا کرتا تھا۔

جالپا کئی بار رما کے ٹھکانے تک ہو آئی۔ وہ جانتی تھی کہ ابھی رما نہیں آئے ہیں پھر

بھی وہاں کا ایک چکر لگا آنے میں اُسے ایک عجیب تسلی ہوئی تھی۔

جالپا کچھ پڑھتے پڑھتے یا لیٹے لیٹے تھک جاتی تو ایک لمحہ کے لئے کھڑکی کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ ایک دن شام کو وہ کھڑکی کے سامنے آئی تو سڑک پر موٹروں کی قطار نظر آئی۔ تعجب ہوا اتنی موٹریں کہاں جاتی ہیں غور سے دیکھنے لگی کل چھ موٹریں تھیں ان میں پولیس کے افسر بیٹھے تھے۔ آخری موٹر پر اس کی نگاہ پڑی تو سارے جسم میں ایک برقی رَو سی دوڑ گئی وہ ایک محویت کے عالم میں کھڑکی سے زینے تک دوڑی ہوئی گئی۔ گویا موٹروں کو روک لینا چاہتی تھی۔ لیکن اتنی ہی دیر میں اسے معلوم ہو گیا کہ میرے نیچے پہنچتے پہنچتے موٹریں نکل جائیں گی۔ وہ پھر کھڑکی کے سامنے آگئی۔ رما اب بالکل سامنے آگیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جالپا نے اشارہ سے کچھ کہنا چاہا لیکن حیا مانع ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ رما کی موٹر کچھ دھیمی ہو گئی ہے۔

دیبی دین کی آواز بھی سنائی دی۔ مگر موٹر رُکی نہیں۔

جالپا نے زینہ پر آکر کہا۔ دادا!

دیبی دین نے سامنے آکر کہا۔ بھیّا آگئے وہ کیا موٹر جا رہی ہے۔

یہ کہتا ہوا وہ اُوپر گیا۔ جالپا نے شوخی تجسّس کو شرم سے دباتے ہوئے کہا۔ تم سے کچھ کہا۔

دیبی۔ اور کیا کہتے۔ کھالی رام رام کی۔ میں نے خیریت پوچھی۔ دونوں ہاتھوں سے دلاسا دیتے چلے گئے۔ تم نے دیکھا نہیں۔

جالپا نے سر جھکا کر کہا۔ دیکھا کیوں نہیں کھڑکی پر کھڑی تھی۔

انہوں نے بھی تمہیں دیکھا ہوگا۔

کھڑکی کی طرف تو تاکتے تھے۔

بہت چکرائے ہوں گے کہ یہ کون ہے۔

کچھ معلوم ہوا مقدمہ کب پیشی ہوگا۔

کل ہی تو۔

تب تو جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیئے۔ میرا خط کسی طرح انہیں مل جاتا تو کام بن جاتا۔

دیی دین نے اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہے تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتی ہو اتنا آسان نہیں ہے۔

جالپا نے اس کے دل کی کیفیت سمجھ کر کہا۔ کیا تمہیں شبہ ہے کہ وہ اپنا بیان تبدیل کرنے پر راضی نہ ہونگے۔

دیی دین کہ اب اسے تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بولا۔ ہاں بہوجی! مجھے اس کا بہت بڑا اندیشہ ہے اور سچ پوچھو تو ہے بھی جوکھم۔ اگر وہ بیان بدل بھی دیں تو پولیس کے پنجے سے چھوٹ نہیں سکتے۔ وہ کوئی دوسرا الزام لگا کر انہیں پھر پکڑے گی اور کوئی نیا مقدمہ چلا دے گی۔

جالپا نے ایسی نظروں سے دیکھا گویا اسے اس کا بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ پھر بولی دادا میں انہیں پولیس کے پنجے سے بچانے کا ٹھیکہ نہیں لیتی۔ میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ ممکن ہو تو انہیں رسوائی سے بچاؤں۔ اگر وہ سچ مچ ڈکیتیوں میں شریک ہوتے تب بھی میں یہی چاہتی کہ آخر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہیں، میں یہ کبھی پسند نہ کرتی کہ وہ دوسروں کو دغا دے کر مخبر بن جائیں۔ لیکن یہ معاملہ تو بالکل جھوٹ ہے۔ میں یہ کسی طرح نہیں برداشت کر سکتی کہ وہ اپنی غرض کے لئے جھوٹی شہادت دیں۔ اگر انہوں نے اپنا بیان نہ بدلا تو میں عدالت میں جا کر ساری قلعی کھول دوں گی۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے قطع تعلق کر لیں۔ میری صورت نہ دیکھیں، یہ مجھے منظور ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے بے گناہ کا خون ان کی گردن پر ہو۔

دیی دین نے اُسے عقیدت کی نگاہوں سے دیکھو کہا۔ تم سب کچھ کرو گی بہو جی۔ اب مجھے بسواس ہو گیا۔ جب تم نے کلیجہ اتنا مضبوط کر لیا ہے تو تم سب کچھ کر سکتی ہو۔

تو یہاں سے نو بجے چلیں۔

میں تیار ہوں۔

(۳۸)

وہ رما ناتھ جو پولیس کے خوف سے باہر نہ نکلتا تھا جو دیی دین کے گھر میں چوروں کی طرح پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ آج دو مہینوں سے رئیسانہ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آسائش کے سبھی سامان موجود ہیں۔ خدمت کے لئے چوکیداروں کی ایک فوج کھانا پکانے کے لئے کاشمیری باورچی۔ بڑے بڑے افسر اس کی دلجوئی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے منہ سے بات نکلی نہیں کہ پوری ہوئی۔ اتنے ہی دنوں میں اس کے مزاج میں اتنی نفاست آ گئی ہے گویا وہ خاندانی رئیس ہو۔ اسے کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کتنے ہی بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہا ہوں اسے اپنی حالت پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا۔ رات کو وہ افسروں کے ساتھ سنیما یا تھیٹر دیکھنے جاتا ہے۔ شام کو موٹروں کی سیر ہوتی ہے۔ دلچسپی کے نت نئے سامان مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ جس دن مجسٹریٹ نے ملزموں کو سشن سپرد کیا سب سے زیادہ خوشی رما کو ہوئی۔ گویا اس کی خوش نصیبی کا تارا طلوع ہو رہا ہے۔

پولیس کو معلوم تھا کہ سشن جج کی عدالت میں یہ گھر کی کھیتی نہ ہوگی۔ اتفاق سے جج صاحب ہندوستانی تھے۔ اور حق پروری کے لئے بدنام۔ پولیس ہو یا ملزم ان کی نگاہ میں دونوں برابر تھے۔ وہ کسی کے ساتھ رعایت نہ کرتے تھے۔ اس لئے

پولیس نے ایک بار رما کو ان مقامات سے روشناش کرا دینا ضروری سمجھا۔ جہاں وارداتیں ہوئی تھیں، ایک زمیندار کے سجے سجائے بنگلہ میں یہ جماعت فروکش ہوئی۔ دن بھر لوگ شکار کھیلتے رات کو گراموفون سنتے تاش کھیلتے یا بجریے پرندے کی سیر کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شہزادہ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ان دلچسپیوں میں رما کو کوئی آرزو تھی تو یہ کہ جالپا بھی یہاں ہوتی۔ اب تک وہ محتاج تھا مفلس تھا اس کی خواہشیں گویا نیم جان ہو رہی تھیں، نسیم کے ان ٹھنڈے جھونکوں نے انہیں بیدار کر دیا۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ یہ مقدمہ ختم ہوتے ہی اسے کوئی عہدہ مل جائے گا تب وہ جا کر جالپا کو منا لائے گا۔ اور زندگی کے لطف اٹھائے گا وہاں وہ ایک نئی زندگی ہوگی، اس کے اصول کچھ اور ہوں گے معیار کچھ اور ہوں گے۔ اس میں سخت پابندیاں ہوں گی۔ اور بیدارانہ بندشیں۔ اب اس کی زندگی کا کچھ مقصد ہوگا۔ کچھ نصب العین ہوگا محض کھانا سونا اور روپے کے لئے ہائے ہائے کرنا ہی آل زندگی نہ ہوگا۔ اسی مقصد کے ساتھ اس بے اصولانہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نفس کی گہرائیوں نے اسے یہ دن دکھایا تھا اور اب تک نئے نئے بے اوث زندگی کا خواب دکھا رہی تھی۔ شرابیوں کی طرح ایسے اشخاص بھی روز ہی پاک ارادے کرتے ہیں۔ لیکن ان ارادوں کا انجام کیا ہوتا ہے، نئی نئی ترغیبیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ اور آغازِ اصلاح کی میعاد ٹلتی چلی جاتی ہے، نئی سحر کا طلوع کبھی نہیں ہوتا۔

ایک مہینہ دیہات کی سیر کرنے کے بعد رما اپنے ناز برداروں کے ساتھ اپنے بنگلہ پر جا رہا تھا راستہ دیبی دین کے گھر کے سامنے سے تھا۔ کچھ دور ہی سے اپنا کمرہ دکھائی دیا۔ اس کی نگاہیں خواہ مخواہ اوپر اٹھ گئیں، کھڑکی کے سامنے کوئی کھڑا تھا اس نے سوچا اس وقت دیبی دین وہاں کیا کر رہا ہے ذرا غور سے دیکھا یہ تو کوئی عورت معلوم دیتی ہے۔ مگر عورت کہاں سے آئی۔ دیبی دین نے وہ کمرہ کرایہ پر تو نہیں

اٹھا دیا۔ ایسا تو شاید وہ کیا کرے گا۔ موٹر حسب اور قریب آئی تو اس عورت کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ رما چونک پڑا۔ یہ تو جالپا ہے بے شک جالپا ہے مگر نہیں، جالپا یہاں کیسے آوے گی، میرا پتہ ٹھکانہ اسے کہاں معلوم، کہیں بڈھے نے اسے خط تو نہیں لکھ دیا ہے تو جالپا ہی۔ نائب دروغہ موٹر چلا رہا تھا، رما نے بڑی منت کے ساتھ کہا — سردار صاحب ایک لمحہ کے لئے رک جائیے میں ذرا دیر دیں سے ایک بات کرلوں نائب نے موٹر دھیمی کر لی۔ لیکن پھر سوچ کر اُسے آگے بڑھا دیا۔

رما نے تیز ہو کر کہا۔ آپ تو مجھے قیدی سمجھ رہے ہیں۔

نائب نے خفیف ہو کر کہا۔ آپ تو جانتے ہیں ڈپٹی صاحب کتنا جامے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

بنگلہ پر پہنچکر رما سوچنے لگا کہ جالپا سے کیسے ملوں۔ وہ جالپا ہی تھی۔ اس میں اسے کچھ ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ آنکھوں کو کیسے دھوکا دیتا۔ دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا کیا کرے کیسے جائے۔ اسے کپڑے اتارنے کی یاد بھی نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ تک وہ کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ کوئی حکمت نہ سوجھی۔ لاچار پلنگ پر لیٹ رہا ذرا دیر میں وہ پھر اُٹھا۔ اور سامنے صحن میں نکل آیا پھاٹک پر چوکیدار کھڑا تھا۔ سڑک پر اسی وقت بجلی روشن ہو گئی۔ رما کو چوکیدار پر ایسا غصہ آیا کہ گولی مار دے۔ سوچنے لگا اگر مجھے کوئی اچھی جگہ مل گئی تو ایک ایک سے سمجھونگا۔ نہیں تو ڈسمس کرا کے چھوڑ دوں گا کیسا شیطان کی طرح سر پر سوار ہے منہ تو دیکھو ذرا معلوم ہوتا ہے بکری کی دُم ہے۔ واہ رے آپ کی پگڑی، کوئی ٹوکری ڈھونے والا قلی ہے ابھی کتا بھونک پڑے تو آپ دُم دبا کر بھاگیں گے، مگر یہاں ایسے ڈٹے کھڑے ہیں گویا کسی قلعہ کے دروازے کی حفاظت کر رہے ہیں۔

ایک چوکیدار نے آکر کہا۔ انسپکٹر صاحب نے بلایا ہے۔ رما جسکے کچھ نئے تورے

منگوائے ہیں۔ رما نے جھلّا کر کہا۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر سوچنے لگا جا لپا اس وقت یہاں کیسے آتی۔ اکیلی آئی ہے یا اور کوئی ساتھ ہے۔ ظالم نے بڈھے سے ایک منٹ بھی بات نہ کرنے دیا۔ جا لپا پوچھے گی تو ضرور کہ کیوں بھاگے تھے۔ صاف صاف کہہ دونگا اس وقت اور کر ہی کیا سکتا تھا مگر ان تھوڑے دنوں کی تکلیف نے زندگی کا مسئلہ تو حل کر دیا۔ اب لطف سے زندگی تو کٹے گی۔ کوشش کر کے اسی طرف اپنا تبادلہ کروالوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے رما کو خیال آیا کہ جا لپا بھی میرے ساتھ یہاں رہے تو کیا ہرج ہے جیسے باہر والوں سے ملنے کی ممانعت ہے، جا لپا کے لئے رکاوٹ ہو سکتی ہے لیکن اس وقت اس مسئلہ کو چھیڑنا مناسب نہیں کل اس کا تصفیہ کرونگا۔ دیبی دین بھی عجیب آدمی ہے پہلے تو کئی بار آیا، مگر آج اس نے بھی چپ سادھ لی۔ کم سے کم اتنا تو ہو سکتا تھا کہ آکر پہرہ والے کانسٹبل کی معرفت مجھے جا لپا کے آنے کی خبر دیتا پھر میں دیکھتا کون جا لپا کو یہاں آنے دیتا۔

رسویا تھالی لایا گوشت ایک قسم کا تھا، رما تھالی دیکھتے ہی جھلّا اٹھا۔ ان دنوں لذیذ کھانا دیکھ کر ہی اُسے بھوک لگتی تھی۔ جب تک چار پانچ قسم کا گوشت نہ ہو، چٹنی اچار نہ ہو اسے کھانے سے رغبت نہ ہوتی تھی۔ بگڑ کر بولا۔ کیا کھاؤں تمہارا سر، تھالی اٹھا لے جاؤ۔

رسویے نے ڈرتے ڈرتے کہا، حضور اتنی جلد اور چیزیں کیسے بنا تا۔ ابھی کل دو گھنٹے تو آئے ہوئے ہیں۔

دو گھنٹے تمہارے لئے تھوڑے ہوتے ہیں۔

اب حضور سے کیا کہوں۔

مت بکو۔

حضور۔

مت بکو۔ ڈیم

رسویئے نے پھر کچھ نہ کہا۔ بوتل لایا برف توڑ کر گلاس میں ڈالی اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

رما کو اس وقت ایسا غصہ آ رہا تھا کہ رسویئے کو نوچ کھائے۔ اس کا مزاج ان دنوں بہت تیز ہو گیا تھا۔

شراب کا دور شروع ہوا۔ تو رما کا غصہ اور بھی تیز ہوا۔ لال لال آنکھیں نکال کر بولا۔ چاہوں تو ابھی تمہارا کان پکڑ کر نکال دوں۔ ابھی اسی دم۔ تم نے سمجھا کیا ہے۔

اس کا غصہ بڑھتا ہوا دیکھ کر رسویا چپکے سے سرک گیا۔ رما نے گلاس لیا اور دو چار لقمہ کھا کر باہر صحن میں ٹہلنے لگا۔ دُھن سوار تھی کیسے یہاں سے نکل جاؤں۔

یکایک اُسے ایسا معلوم ہوا کہ تار کے باہر درختوں کی آڑ میں کوئی ہے۔ ہاں کوئی کھڑا اس کی طرف تاک رہا ہے شاید اشارے سے اپنی طرف بُلا رہا ہے۔ رما کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں مفسدوں نے اس کی جان لینے کی تو نہیں ٹھانی ہے۔ یہ خدشہ اُسے ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ اسی خوف سے وہ رات کو بنگلہ کے باہر بہت کم نکلتا تھا۔ لفظِ جان کے اندیشہ نے اُسے اندر چلے جانے کی تحریک کی۔ اسی وقت ایک موٹر سڑک سے نکلی اس کی روشنی میں رما نے دیکھا وہ اندھیرا سایہ کسی عورت کا ہے اس کی ساڑھی صاف نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ عورت اس کی طرف آ رہی ہے پھر خیال آیا کوئی مرد اس صورت میں میرے ساتھ دغا تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ جیوں جیوں پیچھے ہٹتا تھا وہ سایہ اس کی طرف بڑھتا چلا آتا یہاں تک کہ تار کے پاس آ کر اس نے کوئی چیز رما کی طرف پھینکی۔ رما چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا مگر دیکھا تو صرف ایک لفافہ تھا اس لئے کچھ تسکین ہوئی۔ وہ سایہ بھی تاریکی میں غائب ہو گیا تھا۔ رما نے لپک کر وہ لفافہ اٹھا

لیا خوف بھی تھا اور تعجب بھی۔ خوف کم تھا تعجب زیادہ۔ لفافہ کو جیب میں چھپائے وہ کمرے میں آیا۔ دونوں طرف کے دروازے بند کر لئے اور لفافہ کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ سربمہر دیکھتے ہی اس کے دل میں پھر یہ یاں سی اڑنے لگیں، تحریر جانی پہچانی تھی فوراً لفافہ کھولا۔ ایک ہی سانس میں سارا خط پڑھ گیا اور ایک لمبی سانس لی۔ اسی سانس کے ساتھ توہمات کا وہ بوجھ جس نے چھ ماہ سے اس کی روح کو دبا رکھا تھا وہ سارا درد دل جو اس کے خونِ حیات کو چوسے ڈالتا تھا۔ وہ ساری کمزوری شرم اور خفت جیسے چھومنتر ہو گئی۔ اُسے اتنی تقویت اتنا غرور اور اپنے اُوپر اتنا اعتماد کبھی نہ ہوا تھا۔ پہلی تک یہ سوار ہوئی۔ ابھی چل کر دروغہ سے کہہ دوں۔ مجھے اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن پھر خیال آیا بیان تو اب ہو ہی چکا۔ جتنی رسوائی ہونی تھی ہو چکی۔ اب گناہ کی لذت سے کیوں ہاتھ دھوؤں۔ مگر ان ظالموں نے مجھے کیسا دھوکا دیا ہے کیسا چکمہ دیا ہے اور ابھی تک مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہیں سب کے سب میری دوستی کا دم بھرتے ہیں، مگر ابھی تک اصلی راز مجھ سے چھپائے ہوئے ہیں، اب بھی ان پر مجھے اعتبار نہیں ہے اگر اسی بات پر اپنا بیان بدل دوں تو ناطقہ بند ہو جائے۔ یہی تو ہوگا مجھے کوئی جگہ نہ ملے گی۔ بلا سے ان لوگوں کے منصوبے تو خاک میں مل جائیں گے۔ اس دغا بازی کی سزا تو مل جائے گی۔ اور کچھ بھی نہ سہی اتنی بڑی بدنامی سے تو بچ جاؤں گا۔ یہ سب شرارت ضرور کریں گے۔ لیکن جھوٹا الزام لگانے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں، جب میرا یہاں رہنا ثابت ہی نہیں تو مجھ پر الزام ہی کیا لگ سکتا ہے سبھوں کے منہ میں کالک لگ جائے گی ایک ایک کو اپنی جان کی خیر منانی پڑے گی۔ انہیں چکمہ دونگا کہہ دونگا اگر آج مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی تو میں شہادت دونگا۔ ورنہ صاف کہہ دونگا اس معاملہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہیں تو پیچھے سے چھوٹے موٹے تھانے میں نائب دروغہ بنا کر بھیج دیں اور وہاں سڑا کروں۔ لونگا انسپکٹری اور

کل دس بجے تک میرے پاس تقرری کا پروانہ آجائے۔ وہ چلا کہ اسی وقت دروغہ سے کہے لیکن پھر رک گیا۔ ایک بار جالپا سے ملنے کے لئے اس کی جان تڑپ رہی تھی۔ جالپا سے اتنی محبت اتنی شیفتگی اتنی عقیدت اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ گویا وہ کوئی غیبی طاقت ہے جسے دیوتاؤں نے اس کی حفاظت کے لئے بھیجا ہو۔

دس بج گئے تھے۔ رمانا تھ نے بجلی گل کر دی اور برآمدے میں آکر زور سے کواڑ بند کر لئے جس میں پہرے والے سپاہی کو معلوم ہو اندر سے کواڑ بند کر کے سو رہے ہیں۔ وہ اندھیرے برآمدے میں ایک منٹ تک کھڑا رہا تب آہستہ سے اترا اور کانٹے دار کے پاس آکر سوچنے لگا۔ اس پار کیسے جاؤں شاید جالپا ابھی باغیچہ میں ہو۔ دیبی دین ضرور اس کے ساتھ ہوگا۔ صرف یہ تار اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ اسے پھاند جانا غیر ممکن تھا اس نے تاروں کے بیچ میں ہو کر نکل جانے کا ارادہ کیا اپنے سب کپڑے سمیٹ لئے اور کانٹوں کو بچاتے ہوئے سر اور کندھے کو تار کے بیچ میں ڈالا۔ مگر نہ جانے کیونکر کپڑے پھنس گئے۔ ہاتھ سے کپڑوں کو چھڑانا چاہا تو آستین کانٹوں میں پھنس گئی۔ دھوتی بھی الجھی ہوئی تھی۔ بے چارہ بڑی مصیبت میں پڑا نہ اس پار جا سکتا تھا نہ اس پار۔ ذرا سی بھی غلطی ہوئی اور کانٹے اس کے جسم میں چبھ جائیں گے۔

مگر اس وقت اسے کپڑوں کی پرواہ نہ تھی اس نے گردن اور آگے بڑھائی۔ اور کپڑوں میں لمبا چیرا لگاتا ہوا اس پار نکل گیا۔ سارے کپڑے تار تار ہو گئے۔ پیٹھ میں بھی کھروچے لگے۔ مگر اس وقت کوئی بندوق کا نشانہ باندھ کر بھی اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو وہ پیچھے نہ ہٹتا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں کو اس نے وہیں پھینک دیا۔ گلے کی چادر پھٹ جانے پر بھی کام دے سکتی تھی۔ اسے اوڑھ لیا دھوتی سمیٹ لی اور باغیچہ میں گھومنے لگا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ شاید رکھوالا کھٹک کھانے گیا ہوا تھا اس نے دو تین بار آہستہ آہستہ جالپا کا نام لے کر پکارا۔ کسی کی آہٹ نہ ملی۔

سمجھ گیا جا لپا چلی گئی، وہ انہی پیروں دیبی دین کے گھر کی طرف چلا۔ اسے مطلق خوف نہ تھا بلاسے کسی کو معلوم ہو جائے کہ میں جنگلے سے نکل آیا ہوں۔ پولیس میرا کر ہی کیا سکتی ہے، میں قیدی نہیں ہوں، کسی کی غلامی نہیں لکھائی ہے۔

آدھی رات ہو گئی تھی، دیبی دین آدھ گھنٹہ پہلے لوٹا تھا اور کھانا کھانے جا رہا تھا کہ ایک ننگ دھڑنگ آدمی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ رمانے چادر سر پہ باندھی تھی اور دیبی دین کو ڈرانا چاہتا تھا۔

دیبی دین نے ہکا بکا کر کہا، کون ہے؟

پھر رمانا تھ کو پہچان گیا اور جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ تم نے تو بھیّا کھوب بھیس بنایا ہے کپڑے کیا ہوئے۔

تار سے نکل رہا تھا سب اس کے کانٹوں میں اُلجھ کر پھٹ گئے۔

رام رام بدن میں تو کانٹے نہیں چبھے۔

کچھ نہیں۔ دو ایک کھروچے لگے ہیں، میں بہت بچ کر نکلا۔

بہو کا خط تو مل گیا تھا۔

ہاں اسی وقت مل گیا تھا، کیا وہ بھی تمہارے ساتھ تھیں۔

وہ میرے ساتھ تو نہیں تھیں، میں ان کے ساتھ تھا جب سے انہیں موٹر پہ آتے دیکھا، تبھی سے جانے جانے لگا کے ہوئے تھیں۔

تم نے گھر میں کوئی خط لکھا تھا۔

میں نے کوئی خط وط نہیں لکھا بھیا، جب وہ آئیں تو مجھے خود اچنبھا ہوا کہ بغیر جانے بوجھے کیسے آ گئیں۔ پیچھے انہوں نے بتایا وہ شطرنج والا نقشہ انہیں نے پراگ راج سے بھیجا تھا اور انعام بھی وہیں سے آیا تھا۔

رما حیرت میں آ گیا، جا لپا کی دانشمندی نے استعجاب میں ڈال دیا، اس کے